عراق کی صورتِ حال

خلیل حامدی

عرب سوشلسٹ ریاستیں عرب ممالک کی سیاسیات پر نظر رکھنے والے اس امر سے بے خبر نہیں ہیں کہ ۱۳ عرب ممالک میں سے چار ملک ایسے ہیں جو اپنے آپ کو "سوشلسٹ انقلابی طاقت" (القوی الاشتراکیۃ الثوریہ) شمار کرتے ہیں۔ ان طاقتوں کی سربراہی مصر کے ہاتھ میں ہے، اور شام، الجزائر اور عراق اس کیمپ کے پُرجوش رکن ہیں۔ قارئینِ ترجمان کو مصر کے حالات سے ہم گاہے بگاہے متعارف کراتے رہے ہیں۔ شام کے سوشلزم اور حزب البعث کے خدوخال بھی پچھلے دو شماروں میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ اب ہم آپ کے سامنے چوتھے درجے کی سوشلسٹ طاقت کے ملحنو حال کا جائزہ لیتے ہیں۔ آئندہ انشاءاللہ الجزائر پر روشنی ڈالیں گے تاکہ اس کیمپ کے حدودِ اربعہ اور عرب سیاسیات میں اس کے اثرات سے مکمل آگہی حاصل ہو سکے۔ اور یہ بھی معلوم ہو سکے کہ پچھلے ۲۰ سال میں، جبکہ اسرائیل پورے اطمینان کے ساتھ عرب ملکوں کی کمر توڑ دینے کے لیے جنگی تیاریاں کر رہا تھا، خود ان ملکوں کے اندر کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔

انقلابِ عراق کے اسباب ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کی صبح عراق میں بساطِ شاہی کے اُلٹ جانے کا پیغام لے کر طلوع ہوئی۔ عراق کے شاہی خاندان کا بچہ بچہ تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ عراق کے وزیرِ اعظم نوری السعید کی برہنہ لاش گلیوں میں گھسیٹی گئی۔ چشمِ فلک نے ایک بار پھر بغداد میں وہ سماں دیکھ لیا جو چنگیز خاں اور ہلاکو کے عہد میں دیکھ چکی تھی۔ ملک کو اس خونیں انقلاب کے سپرد کرنے کا سہرا خود نوری السعید کے سر ہے۔ یُوں تو نوری بڑا آزمودہ کار اور زیرک سیاستدان سمجھا جاتا تھا اور بارہا عراق میں اُسے حکومت کرنے کا موقع ملا۔ مگر جولائی ۱۹۵۴ء سے اُس نے اپنی آخری وزارت جس نہج پر تشکیل کی اور جس ڈھب پر اُسے چلایا وہ اُس کی دُوراندیشی اور ژرف نگاہی کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی حماقت اور کم نظری کی دلیل تھی۔ وطن پرست اور اسلام پسند، دونوں قسم کے عناصر

جیلوں میں ڈال دیئے گئے، سیاسی سرگرمیاں ممنوع قرار دے دی گئیں، اخبارات اور پریس کا نام و نشان ختم کر دیا گیا، بنیادی آزادیوں کا جنازہ نکال دیا گیا، ہر قسم کی تنقید کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ فکر و نظر اور فہم و شعور پر مکمل خزاں چھا گئی۔ اور دوسری طرف اُس نے اپنے مطلق العنان اقتدار کے بل پر مغربی ممالک سے ایسے معاہدے کرنے شروع کر دیئے اور ملک کے اہم مسائل و معاملات پر ایسی پالیسیاں اختیار کرنی شروع کر دیں، جن سے ملک کے تمام لوگوں کا بہر حال مطمئن ہونا اور مطمئن رہنا ممکن نہ تھا۔ مگر چونکہ کسی طرف سے کسی عدمِ اطمینان کے اظہار اور کسی پالیسی پر تنقید کا کوئی موقع نہ تھا، اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، اس لیے اس مصنوعی پُرسکون فضا کو دیکھ کر نوری یہ سمجھ بیٹھا کہ سب اچھا ہے۔ حالانکہ دراصل وہ احمق ملک ہی کے حق میں نہیں بلکہ خود اپنے اور اپنی اولاد کے حق میں بھی کانٹے بو رہا تھا۔ قدرت کا زیرِ زمین عادل نظام وہ زنجیریں تیار کر رہا تھا جن سے باندھ کر اُس کی عُریاں لاش کو بغداد کی گلیوں میں گھسیٹا جانا تھا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۵۶ء کو، یعنی انقلاب عراق کے ٹھیک ایک سال ۸ ماہ قبل، عراق کے تمام سیاسی اور غیر سیاسی اور دینی اور ادبی زعماء نے شاہ فیصل والیٔ عراق کو ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں کہا گیا:

"جلالت مآب شاہِ عراق! نوری السعید نے جولائی ۱۹۵۴ء سے اپنی حالیہ وزارت تشکیل کی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ اس نے عوام کے حقوق پامال کر رکھے ہیں۔ شہری آزادیاں ختم ہیں۔ سیاسی زندگی معطل ہے۔ اخبارات کے ڈیکلریشن منسوخ کر دیئے گئے ہیں۔ پریس اور خبر رسانی کے تمام وسائل و ذرائع اس نے اپنے قبضہ میں کر رکھے ہیں۔ غیر ملکی اخبارات اور لٹریچر کا داخلہ بھی بند کیا جا چکا ہے۔ عوامی اجتماعات کے انعقاد کی اجازت نہیں ہے۔ دستوری آزادیوں کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ یہ تمام انتظامات بغداد پیکٹ کے نفاذ کا راستہ ہموار کرنے کے لیے ہیں۔ نوری السعید کو اندیشہ ہے کہ عوام اس پیکٹ کو قبول نہیں کریں گے۔ جب سویز پر سہ طاقتی حملہ ہوا تو نوری السعید نے فوراً ملک کے اندر ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔ اور کثیر تعداد کو جیلوں میں بند کر دیا ۔ ۔ ۔

جلالت مآب! اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت کی پالیسیوں اور عوامی مطالبات کے اندر ہم آہنگی انتہائی ضروری ہے۔ یہ ہم آہنگی معدوم ہو جائے تو ایسی حکومت کا باقی رہنا قومی

مفاد اور ملکی سلامتی کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ آپ کو مختلف اداروں، گروہوں اور شخصیتوں کے ذریعہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ نوری السعید کی حکومت اور عوامی مطالبات کے اندر ہم آہنگی ختم ہو چکی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس وزارت کو فی الفور برطرف کر دیا جائے۔ یہ ایک نہایت اہم وطنی اور ملی تقاضا ہے[1]۔"

عبدالکریم قاسم کا فوجی انقلاب مگر نوری نے فطرت کی اس آواز پر کوئی کان نہ دھرا۔ وہ خود بھی ختم ہوا اور اُس کے سرپرست بھی نیست و نابود ہوئے، اور ملک کا مستقبل بھی ایک عرصہ تک کے لیے مزید اضطراب و بے چینی میں گھر گیا۔ اس کے تشدّدانہ اور سخت گیرانہ رویّے کا سب سے بڑا نقصان جسے آج تک عراق بھگت رہا ہے یہ ہُوا کہ تخریب پسند عناصر تو زیرِ زمین دو ز سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے اور میدان کو خالی پاکر انہوں نے خوب خوب اپنے لیے فضا ہموار کی، مگر کسی صحت مند سیاست کے علمبردار عنصر کے میدان میں نہ ہونے کی وجہ سے عوام کی صحیح تربیت اور تعمیری افکار کی اشاعت کا کام رُک گیا۔ اس یک طرفہ ٹریفک کے نتیجے میں سیاسی توازن اور فکری اور نظریاتی اعتدال ختم ہو گیا اور آخرکار اسی کرب آمیز فضا میں عبدالکریم قاسم، عبدالسلام عارف اور دوسرے فوجی لیڈروں نے ایک فوری نقشۂ انقلاب تیار کیا اور غضب آلود فوجی افسروں کے ذریعہ اُسے عملی جامہ پہنایا اور پُرجوش اور انتقامی جذبات سے بھرپور عوام سے اُسے کامیاب کرایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سابق حکمرانوں کا زن بچہ کولھو میں پیل دیا گیا اور کوئی آنکھ اُن پر آنسو بہانے والی نہ رہی۔ شاہی خاندان اور چند سابق وزراء اور سرکاری افسروں کی لاشیں کئی روز تک ننگے سڑکوں پر گھسیٹتے رہے اور بعض کی لاشیں بجلی کے کھمبوں سے لٹکتی رہیں۔ غضبناک فوجی افسروں کے ہاتھوں سے انقلاب کی یہ خونریز ولادت صاف پتہ دے رہی تھی کہ سرزمینِ عراق کسی اور بڑے حادثے کا نشانہ بننے والی ہے۔ کیونکہ اس طرح کے خونریز انقلابات بے اولاد نہیں رہتے بلکہ ان کی نسل چل پڑتی ہے، اور اس کی اصل ذمّہ داری اُن احمقوں کے سر ہوتی ہے جنہوں نے ابتداءً عوام کی آزادیوں کا گلا گھونٹ کر پُرامن تغیرات کا دروازہ بند کیا تھا اور خونی انقلابات کو خود دعوت دی تھی۔

فوجی عدالت کی سزائیں انقلاب کے بعد "عوامی عدالت" (محکمۃ الشعب) قائم کی گئی۔ کرنل فاضل عباس مہدوی

[1] ملاحظہ ہو جریدہ "الشہاب"، دمشق، شمارہ بابت یکم دسمبر ۱۹۵۶ء۔

کو، جو ایک متعصب کمیونسٹ تھا، اس کا صدر بنایا گیا[1]۔ اس عدالت میں عہدِ ماضی کے "غداروں" پر مقدمات قائم کیے گئے اور انہیں موت اور عمر قید کی سزائیں دی گئیں۔ ایک سال کے اندر اندر ۹۳ ایسے ملزم اس "عدالت" میں پیش کیے گئے جن میں سے بیشتر کو معمولی سماعت کے بعد موت کی سزائیں سنائی گئیں اور دوسروں کو عمر قید جس شخص سے بھی انتقام لینا مقصود تھا اُسے "غداری" کے الزام میں اس عدالت میں کھڑا کیا گیا اور "قرار واقعی" سزا دی گئی۔ فوجی انقلاب نے اگر کوئی کسر اٹھا رکھی تھی تو وہ اس "عوامی عدالت" نے پوری کر دی۔ پورا عراق اس "عدالت" کے فیصلوں سے کانپ اٹھا اور یہ بات کھل کر سامنے آنا شروع ہو گئی کہ یہ انقلاب "سرخ عناصر" کے ہاتھوں میں جا رہا ہے۔

انقلابی گروہ میں اختلاف دوسری طرف انقلاب کی عاجلانہ اسکیم کے نتائج اُبھرنے شروع ہو گئے۔ انقلاب کے بعد جب بادشاہت کی تنسیخ، دستوری اختیارات اور جمہوریہ عراقیہ کے قیام کی بحث شروع ہوئی تو فوجی افسروں کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے۔ فوج دو واضح گروپوں میں بٹ گئی۔ ایک عبدالکریم قاسم کا گروپ جس کی پشت پناہی فوج اور سول کا کمیونسٹ عنصر کر رہا تھا، اور دوسرا گروپ نجیب الربیعی، عبدالسلام عارف، ناظم طبقجلی اور رفعت سری کا تھا جسے وطن دوست اور اسلامی ذہن رکھنے والے عناصر کی حمایت حاصل تھی۔ اول الذکر گروپ عراق کو عرب ممالک سے الگ رکھ کر روسی کیمپ کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتا تھا اور مؤخر الذکر عرب اتحاد کا حامی تھا، بلکہ متحدہ عرب جمہوریہ میں اُسے مدغم کرنا چاہتا تھا۔

عبدالکریم قاسم نے پہلی وزارت جو تشکیل کی وہ بالکل متضاد عناصر سے مرکّب تھی۔ اُس میں وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ اور مسلح افواج کی قیادت کا منصب اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ عبدالسلام عارف کو نائب وزیر اعظم اور نائب کمانڈر اور وزیرِ داخلہ کا عہدہ سپرد کیا۔ اور باقی اکثر و بیشتر وزارتیں کمیونسٹ پارٹی، بعث پارٹی اور عرب قوم

---

[1] واضح رہے کہ نوری السعید کے زمانہ میں کسی کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ عراق میں کوئی کمیونسٹ پارٹی بھی ہے لیکن نوری نے شہری آزادیوں پر جو پہرے بٹھا رکھے تھے ان کی بدولت آئینی طریقوں پر بالائے زمین کام کرنے والوں کے لیے تو تمام راستے بند ہو گئے مگر زیرِ زمین کام کرنے والوں کا راستہ وہ نہ روک سکا۔ وہ اندر ہی اندر اپنی جڑیں پھیلاتے رہے، حتیٰ کہ فوج تک میں گھس گئے۔

پرستوں میں تقسیم کر دی گئیں۔

عبدالکریم قاسم اور عبدالسلام عارف میں پھوٹ عبدالسلام عارف ذاتی لحاظ سے شریف اور نیک دل انسان تھا۔ دینی عناصر کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے تھے مگر اس سے ایک سخت غلطی سرزد ہوئی۔ انقلاب کے بعد اس نے یہ کوشش شروع کر دی کہ عراق اتحادِ عرب میں شامل ہو تاکہ کمیونسٹوں کے چنگل سے محفوظ ہو جائے۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس کے پاس سب سے زیادہ موزوں سہارا اسلام پسند عنصر تھا مگر عراق میں اسلام پسند عنصر سے مراد اخوان المسلمون تھے اور اخوان المسلمون کا گروہ، خواہ وہ مصر سے تعلق رکھتا ہو یا عراق و شام سے، جمال عبدالناصر کی نظر میں یکساں طور پر ناپسندیدہ اور معتوب تھا۔ عبدالسلام عارف نے مصر و شام کے ساتھ اپنے روابط مضبوط کرنے کے لیے اس گروہ کا تعاون مفید نہ پا کر دوسرے عناصر کی طرف رُخ کر لیا۔ دوسرے عناصر سے مراد بعث پارٹی اور قوم پرست تھے۔ بعث پارٹی اگرچہ سوشلزم کی علمبردار تھی مگر ایک مؤثر ہتھکنڈے کے طور پر وہ وحدتِ عربیہ کی داعی بھی تھی۔ قوم پرست ہر اُس بات پر صاد کہنے والے تھے جو قاہرہ سے صادر ہوتی تھی۔ اسلام پسند عنصر سے عبدالسلام مرحوم نے آنکھیں پھیر لیں اور ان نئے ساتھیوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنی شروع کر دی۔ عراق کا کمیونسٹ عنصر اپنی مخصوص تکنیک کی وجہ سے عراق کو عرب ممالک سے بالکل الگ تھلگ رکھ کر اُسے خالص کمیونسٹ اسٹیٹ بنانا چاہتا تھا۔ اور عبدالکریم قاسم جیسا خودسر اور خودپسند اور خودپرست لیڈر اُن کے لیے بے حد موزوں تھا۔ عبدالکریم قاسم کے دستِ راست وصفی طاہر کو فوج اور سول کے کمیونسٹ عناصر نے اپنا آلۂ کار بنایا اور اس کے ذریعہ سے عبدالکریم قاسم اور عبدالسلام عارف کے درمیان اختلاف کو ہوا دینی شروع کر دی۔ عبدالسلام عارف کے بارے میں اُس نے یہ تاثر دیا کہ اس شخص کے پاس بغداد میں فوجی افسروں کا ایک مضبوط گروہ ہے اور وہ کسی وقت بھی قاسم حکومت کا تختہ الٹ سکتا ہے۔ اُدھر فوج کا آزاد گروپ عبدالسلام عارف سے یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ وزارت خالصۃً عسکری ہونی چاہیے اور سول سے جو کمیونسٹ وزراء لیے گئے ہیں انہیں نکال باہر کرنا چاہیے۔

عبدالکریم قاسم کا خدشہ مزید بڑھ گیا، اور اُسے اپنا وہی حشر نظر آنے لگا جو مصر میں جنرل نجیب کا ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے بلا تامل عبدالسلام عارف کو تمام مناصب سے محروم کر کے بون میں سفیر بنا کر بھیج دیا۔ بعض

اور قوم پرست عناصر اس بنا پر مطمئن تھے کہ انہوں نے عبدالسلام عارف جیسی با اثر شخصیت کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ مگر اندرونی طور پر جو لاوا پک رہا تھا وہ یکایک اُبل پڑا اور حالات پر کمیونسٹوں نے پوری طرح غلبہ حاصل کر لیا۔ عبدالسلام عارف کو بون سے واپس بلا لیا گیا اور بعض خود ساختہ الزامات لگا کر اُسے جیل بھیج دیا گیا۔ اب فوج اور سول کے اندر عام پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہوا اور گرفتار شدگان کو "ملٹری کورٹ" میں پیش کیا گیا۔ عبدالسلام عارف کو ملٹری کورٹ کی طرف سے سزائے موت سنا دی گئی۔

کمیونسٹ اقتدار کا قیام اس طرح ملک میں کمیونسٹ حکومت قائم ہو گئی اور کمیونسٹوں نے پندارِ حکومت کے نشے میں اسلام اور مسلمانوں پر تند و تیز حملے شروع کر دیئے۔ نہ صرف اسلام بلکہ عرب قوم پرستی اور عرب اتحاد کا مذاق بھی اڑایا گیا۔ بغداد ریڈیو مصر کے حکمران کو "ناصر الاستعمار" (استعمار کا معاون) کہتا اور قاہرہ ریڈیو عراق کے سربراہ کو "قاسم العراق" (عراق کے حصے بخرے کرنے والا) کے لقب سے پکارتا۔ ایک "بطلِ عرب" (عرب کا ہیرو) تھا اور دوسرا "الزعیم الاوحد (یکتا و یگانہ لیڈر)۔ کمیونسٹوں نے اسی دور میں عراق میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا "اللّٰهُ فی قفص الاتھام (خدا ملزموں کے کٹہرے میں)[1]۔ غیر کمیونسٹ اخبارات بند کر دیئے گئے۔ پریس اور وسائل نشر و اشاعت کا استعمال ہر غیر کمیونسٹ کے لیے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ مسجدوں اور تعلیمی اداروں کے اندر خدا، قرآن اور رسول پر حملے کیے گئے۔ اردگرد کے تمام ممالک کو یقین

---

[1] ایک طرف خدا کا مذاق اڑایا گیا اور دوسری طرف عبدالکریم قاسم کو "ربِّ تموز" (جولائی کا رب) کہا گیا۔ انقلابی حکومت کی طرف سے انقلاب کی پہلی سالگرہ پر جو کتاب شائع ہوئی ہے اُس کی پیشانی پر یہ شعر درج ہے:

یا ربّ تموز ا کبارا اسجلہ   لما صنعت وللتاریخ ماکتبا

لأنت من سنظل الدھر نذکرہ   مالاح نجم علی الدنیا وما غربا

شاعر عبدالکریم قاسم سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے: "اے جولائی کے رب! تو نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اور جریدۂ تاریخ پر جو نقش ثبت کیا ہے اُس کے احترام میں مَیں نے یہ معلومات قلمبند کی ہیں تو وہ ہستی ہے کہ جب تک دنیا میں سلسلۂ روز و شب جاری ہے ہم آپ کا ذکر کرتے رہیں گے (ملاحظہ ہو کتاب: ثورۃ اربعۃ عشر تموز فی عامہا الاوّل"، شائع کردہ حکومتِ عراق، مطبوعہ دارالاخبار، بغداد، جولائی ۱۹۵۹ء)

ہوگیا کہ "عراق تاشقند اور بخارا کی صف میں شمار ہونے والا ہے"۔ زمینداریوں کی تنسیخ اور تحدید اور کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے کے احکام صادر ہوئے۔ اور جو ادارے قومی تحویل میں لیے گئے ان کا کوئی معاوضہ نہ دیا گیا۔ کمیونسٹوں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کی مغرورانہ روش سے عوام الناس کا عرصۂ حیات تنگ ہوگیا۔ اور وہ بیسویں صدی کے تاتاریوں کے بے رحم ہاتھوں میں گرفتار ہوگئے

کمیونزم سے عوام کی بیزاری عراق کی جذباتی اور سیماب صفت قوم اس مصنوعی تغیر اور جفا پیشہ اقتدار کو آسانی سے ہضم کرنے والی نہ تھی۔ عراق کے مسلم عوام اور مذہبی رہنما، شیعہ بھی اور سنّی بھی، عرب بھی اور کرد بھی، سب حالات کے جدید رُخ پر سیخ پا تھے۔ فوج کا اسلام پسند گروپ بھی معتوب ہونے کے باوجود بیتاب عمل تھا۔ اب حالات صاف بتا رہے تھے کہ ملک پھر ایک خونی انقلاب کے لیے تیار ہے۔ فوج کے دو بڑے عہدیدار، ناظم طبقجلی اور رفعت سِرّی اپنی وطن دوستی، دین پسندی اور جرأت و بے خوفی کی وجہ سے مرکز توجہ اور امیدگاہِ مستقبل بن گئے۔ انقلابِ جولائی میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا مگر اس انقلاب کی عاجلانہ اسکیم کی وجہ سے حالات ان کے قابو سے باہر ہوگئے تھے۔

شوّاف کی بغاوت اور قاہرہ مارچ ۱۹۵۹ء کو عراق ایک اور دَور میں داخل ہوگیا۔ قاہرہ کے جاسوس جو اسرائیل کے بجائے خود عربوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے، یہ سُن گن پا گئے کہ ناظم طبقجلی اور رفعت سِرّی فوجی اور قومی پیمانے پر انقلاب کی تیاری کر رہے ہیں اور فوج کا اسلام پسند اور وطن دوست عنصر اور عراق کے تمام مسلم عوام ان کے حامی ہیں اور خطرہ ہے کہ کہیں یہ ملک میں ایک ایسے دور کی طرح نہ ڈال دیں جس میں اخوان کو اُبھرنے کا موقع مل جائے اور عراق میں جمال عبدالناصر کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیں۔ چنانچہ عراق اور شام کے بعثی عناصر اور مصر و شام کی عرب یونین نے مل کر قاہرہ کے حامی انقلاب کی اسکیم تیار کی اور کرنل عبدالوہاب شوّاف کو جو بری اور فضائی فوج کے ایک بڑے حصّہ کا مالک تھا اس اسکیم کے لیے تیار کیا۔ موصل اس اسکیم کا مرکز تھا۔ مارچ ۱۹۵۹ء کی ایک تاریک رات میں موصل میں "شوّاف بغاوت" کا دھماکہ ہُوا۔ قاہرہ ریڈیو سے فوراً اس بغاوت کو آشیرباد ملی مگر عبدالکریم قاسم کمیونسٹوں کی مدد سے بڑی چابکدستی کے ساتھ اس بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ عبدالوہاب شوّاف گرفتار کر لیا گیا۔ عبدالکریم قاسم کمیونسٹوں کا بڑا ممنون ہُوا۔ اور کمیونسٹوں کا پارہ پہلے سے بھی

زیادہ بڑھ گیا۔

عبدالوہاب شواف نے فوجی عدالت کے سامنے جو بیانات دیئے اُن میں یہ افترا پردازی کی کہ انقلاب کی تحریک ناظم طبقجلی کی طرف سے تیار کی گئی تھی۔ اور وہی دراصل اس "بغاوت" کا مرکز ہے مگر سوال یہ ہے کہ شواف کا رینک فوج میں طبقجلی کے رینک سے کم تر تھا۔ طبقجلی جنرل تھا جب کہ شواف بریگیڈیر تھا پھر "بغاوت" کے جو احکام صادر ہوئے تھے وہ شواف کے نام سے کیسے صادر ہوئے؟ بہرحال شواف کے بیانات سے بغاوت کی تمام تر ذمہ داری طبقجلی پر آپڑی کمیونسٹ عنصر طبقجلی سے پہلے ہی شاکی تھا۔ اس لیے عبدالوہاب شواف تو ذبح نکلا مگر غیظ و غضب کے "سرخ پہاڑ" طبقجلی اور ملک کے دیندار عنصر پر ٹوٹ پڑے۔ موصل اور کرکوک میں کمیونسٹوں نے قتل و غارت اور لوٹ مار کا قیامت خیز طوفان برپا کر دیا۔

موصل اور کرکوک میں مسلمانوں کا قتلِ عام | کمیونسٹوں نے حکومت کی شہ پاکر مسلمانوں پر ہلہ بول دیا گھروں میں گھس گھس کر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ عمارات کو مسمار کیا۔ املاک کو تاخت و تاراج کیا۔ مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ ان کی لاشوں کو ٹیلیفون اور بجلی کے کھمبوں اور درختوں پر لٹکایا۔ ان کے جسموں کی تکا بوٹی کی سروں کی کھوپڑیاں اتار پھینکیں۔ زندہ انسانوں کو رسیوں میں باندھ کر بازاروں اور سڑکوں میں گھسیٹا، اور جب وہ تاب نہ لاکر دم توڑ گئے تو ان کی لاشوں کو غلاظت کے گڑھوں میں پھینک دیا۔ زندہ انسانوں کو دفن کیا۔ ان کے پیٹ چاک کیے۔ انسانوں کو ذبح کر کے سڑکوں کے دو رویہ ستونوں پر لاشوں کو اس طرح لٹکایا جس طرح مذبح میں بھیڑ بکریوں کو کھال اتار کر لٹکایا جاتا ہے۔ مسجدوں اور مدرسوں کی بے حرمتی کی۔ اسلامی کتب خانوں کو جلایا۔ موصل کی جامع الجادریں میں داخل ہو کر نمازیوں پر فائرنگ کی۔ موصل کی مشہور جامع مسجد دانیال کو اڑا دیا۔ قرآن کریم کی بے حرمتی کی اور اس کے اوراق کو پھاڑا اور انہیں پامال کیا۔ موصل کی جامع الحوریجانی کے امام کو مسجد کے مینار کے ساتھ باندھا، پھر اُسے اتار کر زندہ گلیوں میں گھسیٹا یہاں تک کہ وہ دم توڑ گیا۔ موصل کے نامور مذہبی رہنما شیخ علی العمری اور ان کی بیٹی حفصہ کو قتل کیا اور باپ بیٹی دونوں کی لاشوں کو ننگا کر کے بازاروں میں گھسیٹا، ان کی لاشوں کی تکا بوٹی کی اور ان کے مکان کو نذرِ آتش کر دیا۔ حد یہ ہے کہ ایک لڑکی کی دونوں ٹانگوں کو دو جیپوں کے ساتھ باندھ کر ان کو مخالف سمتوں میں پورے

زور سے چلا دیا، یہاں تک کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ غرض مسلمان کا خون اس قدر ارزاں ہوا کہ موصل اور کرکوک کے در و دیوار لالہ زار ہو گئے۔ نہ عزت و ناموس کا احترام باقی رہا اور نہ جان و مال کا تحفظ۔

مذہبی رہنماؤں کو خاص طور پر نشانہ درندگی بنایا گیا اور اس میں یہ تمیز نہیں کی گئی کہ کون حکومت کا ثنا خواں تھا اور کون مخالف۔ کمیونسٹ پارٹی کے دفتروں اور مرکزوں میں لاشوں کے انبار لگ گئے۔ موصل اور کرکوک میں ۵ ہزار کے قریب انسان کمیونسٹوں کی درندگی اور بہیمیت کی بھینٹ چڑھے اور کئی روز تک یہ شہر سنسان جنگل کا منظر پیش کرتے رہے۔

کمیونسٹ پارٹی کے چھوکرے بازاروں میں میز کرسی رکھ کر "عدالت لگا بیٹھتے تھے جس کا نام تھا "عوامی عدالت" (پیپلز کورٹ)۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پکڑ پکڑ کر ان "عدالتوں" میں پیش کیا جاتا اور ایک دو سوالوں کے بعد انہیں سخت سزائیں سنا دی جاتیں۔ کسی کو تازیانے لگائے جاتے، کسی کو رسی سے باندھ کر بازاروں میں گھسیٹنے کی سزا دی جاتی اور کسی کو گولی سے اڑا کر ننگا لٹکا دیا جاتا۔ موصل کی "عدالت" کا سربراہ عبدالرحمان قصّاب ایک پکا کمیونسٹ تھا۔ اس نے سینکڑوں انسانوں کو آن کی آن میں خون کے دریا میں نہلا دیا۔ عبدالکریم قاسم کا خصوصی رفیق وصفی طاہر ان ہنگاموں کی ایک ایک منٹ کی خبر معلوم کر رہا تھا۔ موصل میں عدنان جابر نامی ایک شخص اس خدمت پر مامور تھا کہ وہ حالات کی فوری رپورٹ وصفی طاہر تک پہنچائے۔ وصفی طاہر بار بار اس سے دریافت کرتا کہ کیا تم نے فلاں کو بازار میں گھسیٹا ہے؟ اور کیا فلاں مسجد کو مسمار کر چکے ہو؟

دیندار فوجی افسروں کو سزائے موت یہ تو موصل اور کرکوک کے شہروں کا حال تھا جو عراق میں اسلامیت کے مرکز سمجھے جاتے ہیں۔ ادھر بغداد کا حال بھی بڑا نازک تھا۔ تمام اسلام پسند افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ فوج کے اعلیٰ ترین عہدیدار ناظم طبقچلی اور رفعت سرّی "بغاوت" کے الزام میں فاضل عباس مہداوی کی "عوامی عدالت" میں پیش کیے گئے، اور انہیں وہاں سے موت کی سزا سنائی گئی جو فوراً نافذ کر دی گئی۔ سترہ اور بھی بہترین فوجی افسروں کو لپیٹ میں لے لیا گیا اور انہیں بھی پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا۔ بغداد کے اسلامی مکتبوں اور مدرسوں پر بھی دست درازیاں کی گئیں مشہور اسلامی رہنما شیخ محمد محمود صوّاف کے اخبار "لواء الاخوۃ الاسلامیۃ" کے دفتر اور پریس کو جلا دیا گیا۔ خود شیخ صوّاف کا تعاقب

بھی کیا گیا۔ مگر موصوف چھپ چھپا کر شام چلے گئے۔ علمائے دین اور مذہب پسندوں کے لیے یہ حادثہ شورِ محشر سے کم نہ تھا۔ بڑے بڑے لوگ ملک سے ہجرت کر کے شام اور اردن کی طرف نکل کھڑے ہوئے، حتیٰ کہ عراق کے مشہور ترین سن رسیدہ عالم شیخ امجد الزھادی تک کو، جو ترکی حکومت کے زمانہ میں عراق کے قاضی القضاۃ رہ چکے ہیں، بھاگ کر مدینہ منورہ میں پناہ لینی پڑی۔[1]

عوام کا ردِّ عمل اور کمیونسٹوں کا زوال موصل اور کرکوک کے قتل عام سے پورے ملک میں سراسیمگی چھا گئی۔ کمیونسٹوں کی جرأت اور حکومت کی کمیونسٹ نوازی پر ہر شخص انگشت بدنداں تھا۔ ملک کا مستقبل ہولناک تیرگی کے منہ میں تھا۔ کمیونزم کا اژدھا اس طرح پھنکار رہا تھا کہ دین اور اہلِ دین دم بخود تھے۔ بغداد میں فاضل عباس مہداوی اور موصل میں عبدالرحمان قصاب کی "عدالتیں" اسپین کی "تحقیقاتی عدالتوں" کی طرح انسانی مذابح میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ جب ناظم طبقچلی اور رفعت سرّی اور دوسرے سترہ فوجی افسروں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تو ملک کا پیمانۂ صبر یکلخت چھلک گیا۔ کمیونسٹوں کے خلاف ملک بھر میں شدید غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے۔ حکومت نے کمیونسٹوں کی مدد سے ان مظاہروں کو گولی کی طاقت سے دبانا چاہا۔ مذہبی اور ملی رہنماؤں پر ان مظاہروں کو بھڑکانے کا الزام لگایا۔ مگر حکومت کی یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ عوام الناس عبدالکریم قاسم کی حکومت کے خلاف یکایک اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

کمیونسٹوں نے عبدالکریم قاسم کا ساتھ اس لیے دیا تھا کہ ان کے مقاصد کے لیے جمہوریت کی بہ نسبت ڈکٹیٹر زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ ڈکٹیٹر کے زیرِ سایہ رہ کر اگر وہ ملک کے دروبست پر ایک دفعہ چھا جائیں تو ملک پر قبضہ کرنے کے لیے بس ایک آدمی کو ہٹا دینے کا مسئلہ باقی رہ جاتا ہے جسے حل کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ مگر کبھی معاملہ برعکس بھی ہو جاتا ہے۔ ڈکٹیٹر کسی کا دوست نہیں ہوتا، نہ اسے کسی نظریے سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اسے تو صرف اپنے اقتدار سے دلچسپی ہوتی ہے اور اس کے لیے وہ آج ایک شخص کا دوست ہوتا ہے، تو کل اسی کا دشمن ہو

---

[1] مقامی یہ پوری داستان اسی زمانہ میں عراق سے نکلنے والے ادیبوں، صحافیوں اور علماء نے اخبارات و رسائل میں بھی اور پمفلٹوں کی شکل میں بھی شائع کر دی تھی جس میں واقعات کے فوٹو بھی موجود تھے۔ اس زمانے میں شام اور اردن کے شہر عراق کے پناہ گزینوں سے بھرے ہوئے تھے اور وہ خود اپنے اوپر گزرے ہوئے اور آنکھوں دیکھے ظلم و ستم کی ایسی ایسی داستانیں سناتے تھے جن سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

جاتا ہے۔ عبدالکریم قاسم نے یہ دیکھ کر کہ پوری فضا اس کی دشمن ہو گئی ہے اور کمیونسٹوں کی حمایت میں اسے لینے کے دینے پڑ رہے ہیں، یکایک اپنی پالیسی تبدیل کر دی اور کمیونسٹوں کی مخالفت شروع کر دی۔ اس نے یکے بعد دیگرے ایسے بیانات دیے جن میں موصل اور کرکوک کے ہنگاموں کی ذمہ داری کمیونسٹ پارٹی پر عائد کی۔ کمیونسٹوں پر شدید طعن و تشنیع کی، انہیں چنگیز خاں اور ہلاکو سے تشبیہ دی۔ بغداد کے جلاد فاضل عباس مہداوی کو ملک سے رخصت کیا۔ موصل کا جلاد عبدالرحمن قصاب روپوش ہو کر ماسکو فرار ہو گیا۔ اب عتاب کا رخ تمام تر کمیونسٹوں کی طرف تھا۔ موصل اور کرکوک میں کمیونسٹ ڈرے ہوئے کتوں کی طرح ہر اوٹ کی پناہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ فطرت کی تعزیریں انہیں کیسے کا مزہ چکھا رہی تھیں۔ ۲۰۰ بڑے بڑے کمیونسٹ لیڈر مارے گئے۔ اکثر و بیشتر نے موصل اور کرکوک سے بھاگ کر بغداد میں جا کر پناہ لی، اور سابق سرپرست کی حمایت چاہی۔ مگر کہیں ان کو پناہ نہیں مل سکی۔ عبدالکریم قاسم نے اب کمیونزم سے "تائب" ہو کر قوم پرستوں اور بعثیوں سے ملی بھگت کر لی۔ نئی وزارت میں تمام وزراء قوم پرست اور بعثی لیے گئے اور اسلامی عناصر کے ساتھ صرف اس حد تک اس نے تعاون کیا کہ ان کی بعض تقریبوں میں شمولیت کی اور میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں کا افتتاح کر دیا۔

فروری ۱۹۶۰ء سے ملک میں سیاسی چہل پہل بھی شروع ہو گئی۔ کئی نئے سرکاری اخبارات جاری ہوئے۔ مثلاً الشّورہ، الاھالی، المبدأ وغیرہ۔ ان اخبارات نے کمیونسٹوں کی ریشہ دوانیوں، سازشوں، غداریوں، وطن فروشانہ اسکیموں اور ستمرانیوں کو خوب خوب بے نقاب کرنا شروع کر دیا۔ حکومت کی طرف سے جماعت سازی کی اجازت کا قانون صادر ہوا۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر متعدد سیاسی پارٹیاں قائم ہوئیں۔ ان میں سے ایک نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی تھی جو قوم پرست اور بعثی عناصر کی نمایندگی کرتی تھی۔ دوسری کرد پارٹی جو عراق کے اندر علیحدہ کرد اسٹیٹ کے قیام کی حامی تھی۔ تیسری کمیونسٹ پارٹی جو ان کمیونسٹ لیڈروں نے قائم کی تھی جو اصل کمیونسٹ پارٹی سے الگ ہو گئے تھے اور ان ہنگاموں سے برأت کا اظہار کر رہے تھے جن کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ اصل کمیونسٹ پارٹی پھر زیر زمین چلی گئی۔ عراق کے اسلام پسند عناصر نے بھی ایک پارٹی کی تاسیس کی جس کا نام "الحزب الاسلامی" رکھا گیا۔ اس کا باقاعدہ ملک گیر انتخاب ہوا، لائحہ عمل اور دستور مرتب کیا گیا اور جب اجازت حاصل کرنے کے لیے حکومت کو درخواست دی گئی تو حکومت نے مختلف بہانہ تراشیوں سے اس کی درخواست نامنظور کر دی۔ حکومت کے اس فیصلے کو بغداد ہائی کورٹ

میں چیلنج کیا گیا۔ عدالت نے حکومت کے فیصلے کو خلافِ قانون قرار دے کر کالعدم کر دیا اور پارٹی طمطراق کے ساتھ میدان عمل میں اُتر آئی۔ الحزب الاسلامی نے تین اخبارات جاری کیے۔ الحیاد، الفیحاء، الجہاد۔ مگر حکومت کی طرف سے ان اخبارات پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہوتی رہیں اور وہ یکے بعد دیگرے بند ہوتے گئے۔ مجموعی طور پر بعث پارٹی ملک میں غالب اثر کی مالک ہو گئی۔

قاسم اور کمیونسٹوں میں دوبارہ اتحاد

عبدالکریم قاسم اور کمیونسٹ عناصر کے درمیان مخالفت کا وقفہ بہت مختصر رہا۔ عبدالکریم قاسم کو عوام کی نگاہ میں گرتا دیکھ کر عراق کی بعث پارٹی نے اس کو قتل کر کے ملک پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی اسکیم تیار کی۔ عبدالکریم قاسم پر بغداد کے ایک چوک میں ناکام حملہ بھی ہوا۔ اور اُسے اسپتال داخل ہونا پڑا۔ اس کے بعد سرخوں کی پھر بن آئی اور انہوں نے عبدالکریم قاسم سے مصالحت کر لی۔ عبدالکریم قاسم بعثی، قومی اور وطنی عناصر کے خلاف ہو گیا اور کمیونسٹوں کو ہی اپنا اصل محافظ سمجھنے لگا۔ اس مصالحت کے بعد ملک کے اندر پہلی حالت پھر عود کر آئی۔ اور کمیونسٹوں کو پھر غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس مرتبہ انہوں نے سطحی اور انتقامی جوش و خروش کے بجائے ملک کے اندر بنیادی تبدیلیوں کا راستہ اختیار کیا حتیٰ کہ شرعی قوانین تک میں تبدیلیاں شروع کر دیں جن سے ملک میں سخت نفرت کا اظہار کیا گیا۔ دوسری طرف معاشی تبدیلیوں سے عراق کی برطانوی تیل کمپنی نے بھی جو اب تک کمیونسٹوں کی سرگرمیوں پر خاموش تھی، تشویش کا اظہار شروع کر دیا۔ عوام کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کمیونسٹوں کے برسرِ اقتدار آجانے سے کہیں پھر پچھلے مظالم کا اعادہ نہ ہو۔ اور فوج میں بھی طاقت ور عناصر عبدالکریم قاسم کے دشمن ہو گئے کیونکہ ان کے بڑے بڑے لیڈروں کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا۔ آخر کار عبدالسلام عارف اور بعض دوسرے فوجی افسروں نے انقلاب برپا کر کے عبدالکریم قاسم ہی کا نہیں، اس کی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ یوں ۶۳ء میں عراق نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

(باقی)